Volume 03, Issue 01,
January-March 2025
PP: 45-54
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

اردو میں نسائی آپ بیتی کے اولین نقوش

First Impressions of Feminist Autobiography in Urdu

Riaz Hussain[1]

Article History

Received
05-01-2025

Accepted
19-01-2025

Published
02-02-2025

Abstract & Indexing

Abstract

Autobiography is a significant literary genre that provides a personal account of an individual's life experiences, self-reflections, and historical events. It is an essential form of self-expression that allows writers to document their struggles, achievements, and personal evolution. In Urdu literature, female writers have actively contributed to the development of autobiographical writing, using it as a tool to highlight their social, cultural, and intellectual experiences. The first recorded female autobiography in Urdu was written by Shehrbāno Begum under the title Bītī Kahān in 1886. This marked the beginning of a rich tradition of autobiographical writing among Urdu-speaking women. Over time, several prominent female writers, including Nādir Jahān, Wazīr Sulṭān, ʻAṭiyyah Fayḍī, and Qurrat al-ʻAyn Ḥaydar, wrote their autobiographies, reflecting diverse perspectives on gender roles, societal expectations, and literary contributions.

These autobiographies not only provide insights into personal lives but also serve as historical and sociocultural documents, offering perspectives on women's roles in different time periods. They capture the challenges faced by women in their pursuit of education, independence, and literary aspirations. This study aims to analyze the significance of these pioneering female autobiographies in Urdu literature by exploring their themes, narrative styles, and contributions to women's literary history. By examining these works, the article sheds light on the evolving nature of female self-expression in Urdu literature and its impact on contemporary feminist discourse.

Keywords

Autobiography, Urdu Literature, Female Writers, Self-Expression, Gender Roles, Socio-Cultural History, Literary Contributions, Feminist Discourse, Narrative Style, Personal Reflections.

[1] ***Principal, Government Associate College Bhera, Sargodha.***
riazhussainammir@gmail.com

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کا اوائل وہ عرصہ ہے جب ادب میں خواتین کے لیے بند دروازے کھولے گے، ورنہ قبل ازیں خواتین کا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور کسی لڑکی کا لکھنا بے حیائی کا ارتکاب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں دل چسپ بات یہ بھی ہے کہ دیگر اصناف میں تو خواتین تاخیر سے رونما ہونا شروع ہوئیں لیکن خود نوشت سوانح عمری وہ صنف ہے جس میں خواتین اول دن سے ہی سرگرم دکھائی دیتی ہیں اور بعض محققین کا تو یہ بھی خیال ہے کہ اردو کی اوّلین آپ بیتی ایک خاتون ہی کی لکھی ہوئی ہے۔

وہ یوں کہ جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" کو عمومی طور پر اردو کی پہلی خود نوشت سوانح عمری مانا جاتا ہے لیکن اول تو اس کے یادداشت یا سوانح عمری یا سفر نامہ ہونے پر سوالات موجود ہیں۔ دوسرا یہ کہ کالا پانی 1886ء میں لکھی گئی تھی، جبکہ "بیتی کہانی" وہ آپ بیتی ہے جو 1885ء میں لکھی گئی۔ نواب پٹودی کے خاندان سے تعلق رکھنے والی اس کی مصنفہ کا نام شہر بانو بیگم تھا جنہوں نے جنوری 1886ء میں ترمیم و اضافہ کیا اور مکمل کیا۔ ہاں البتہ اس کے چھپنے میں سو سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا یہ معین الدین عقیل کی تدوین کے بعد پہلی بار 1995ء میں شائع ہوئی، یوں اسے اردو کی اوّلین آپ بیتی کہا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک خواتین کے ہاں خاموشی رہی پھر ایک اور خاتون جن کا تعلق بھی شاہی خاندان سے تھا، انہوں نے "افسانہ نادر جہاں بیگم" کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھی۔ اس کے بعد شاہ جہاں بیگم نے "نیرنگِ بخت" کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھی اور پھر تحصیلِ علم جیسی آپ بیتی عطیہ فیضی نے لکھی۔ تزکِ سلطانی اس کے بعد لکھی جانے والی قابلِ ذکر آپ بیتی ہے۔ یہ سلسلہ 1942ء تک جاری رہا اور پھر تقسیم ہوئی اور ادب بھی دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ تاریخی طور پر یہ وہ دورانیہ ہے جب اردو کی نسائی آپ بیتی کے اوّلین نقوش اُبھر کر سامنے آئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد سرحد کے دونوں طرف خواتین نے آپ بیتیاں لکھیں۔ پاکستانی اردو ادب میں حمیدہ اختر، ادا جعفری، قرۃ العین حیدر، کشور ناہید جیسی پختہ خود نوشت نگار ان میں اہم ہیں، اکیسویں صدی نسائی آپ بیتی کے لیے ایک زرخیز صدی ہے کیونکہ اس کے آغاز سے اب تک تعداد میں اس قدر آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں کہ اتنی دو صدیوں میں نہیں لکھی گئیں۔ اگر معاصر نسائی آپ بیتی کو دیکھا جائے تو اب تک کے بیس سالوں میں خواتین نے 100 سے زائد آپ بیتیاں لکھی ہیں، جن میں کشور کی نوٹ بک، بانو قدسیہ کی راہ رواں کے علاوہ ایک طویل فہرست ہے جن میں محض ادیب خواتین کی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے، تو یوں شہر بانو بیگم سے شروع ہونے والا یہ سفر بانو قدسیہ تک آ پہنچتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اردو میں خواتین کی خود نوشت کو الگ تخلیقی و ادبی تناظر میں نہیں دیکھا گیا اور اگر کسی ادبی مؤرخ نے اس روایت کا تذکرہ کیا ہے تو وہ بھی سرسری اور بہت مختصر، خواتین کی لکھی گئی آپ بیتیاں دراصل زندگی کو دیکھنے کا ایک مکمل زاویہ ہے جس سے ادب اور زندگی دونوں کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی لیے خواتین کی لکھی ہوئی خود نوشتیں مردوں کو ضرور پڑھنی چاہئیں۔

یہاں ہم اردو میں ادیب خواتین کی آپ بیتی کے ابتدائی دور کا مطالعہ کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ اس دور میں لکھی گی آپ بیتیوں کے موضوعات اور فنی اختصاص کیا ہیں۔

بیتی کہانی از شہر بانو بیگم:

نسائی آپ بیتی کا نقشِ اوّل بیتی کہانی ہے، جو شہر بانو بیگم کی لکھی ہوئی ہے۔ شہر بانو ریاست پٹودی کے ایک نواب گھرانے میں 1848ء میں پیدا ہوئیں، ان کے والد نواب اکبر علی خان نے بارہ شادیاں کیں ان کی نویں بیوی سے بانو بیگم پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق پٹھان قبیلے سے تھا اور ان کے بزرگ شیخان کہلاتے تھے۔

بیتی کہانی 1857ء میں لکھی گئی اور پہلی دفعہ جنوری 1887ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ اسے اردو کی اوّلین نسائی خود نوشت کہا گیا ہے، اس حوالے سے خود نوشت کے معروف محقق ڈاکٹر معین الدین عقیل نے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ 1995ء میں علمی ادارہ حیدر آباد سے اس آپ بیتی کو شائع کیا اور اس آپ بیتی کے محرکات بھی بیان کیے۔ شہر بانو بیگم نے دیباچہ میں اس کی یوں وضاحت کی ہے:

> اس کے لکھنے میں مجھے کئی باتوں کا لحاظ رہا۔ اول تو یہ کہ بیان کو بہت طول نہیں دیا مختصر کیا ہے، دوسرے یہ کہ خلاف واقعہ کوئی بات نہیں لکھی۔ بناوٹ کو ہر گز دخل نہیں دیا، عبارت آرائی کچھ نہیں کی اور مطلب کو روز مرہ کی بول چال میں ایسے آسان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ میں صاحبہ کی سمجھ میں اچھی طرح آجائے۔[1]

شہر بانو نے بیتی کہانی اپنی انگریز دوست کی فرمائش پر لکھی جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ "بیتی کہانی" کے پس منظر میں چند سماجی اور سیاسی مقاصد موجود ہیں، جبکہ ادبی مقصد پس پردہ چلا گیا ہے۔ "بیتی کہانی" کو شہر بانو نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے:

ابتداء میں مصنفہ نے اپنے پیدائش، منگنی، شادی اور محل کے رہن سہن کا ذکر کیا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ جب ان کا رشتہ نواب خاندان میں طے ہوا تو محل میں شادیانے ناچ گانے انعامات تقسیم ہوئے۔ ایک جگہ وہ اپنی بارات کی شان و شوکت اور انتظامات کا نقشہ یوں کھینچتی ہیں:

> ایک پلٹن پیادہ اور پانچ سوار ایک توپخانہ، بگھیاں، خامے، گھوڑے، ہاتھی تھی، تمام دہلی اور اس کے آس پاس کے رئیس امیر سینکڑوں تماشائی۔ سنا ہے رات بھر اس میں چراغوں کی ایسی روشنی رہتی تھی کہ دن کے اُجالے مات کرتے تھے۔[2]

بانو کی شادی اوائل عمری میں ہوگئی تھی۔ صبح نماز کے بعد شہر بانو اور محمد نور علی کا نکاح ہوا، ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کا مہر بندھا۔ ڈھائی روپیہ اور ایک دوشالہ قاضی کو نکاح خوانی کا دیا گیا۔ آگے چل کے انہوں نے غدر کے حالات پر بھی بات کی ہے، اپنے گھر کا لٹنا، رئیس جھجھر کی گرفتاری اور پھانسی، ریاست کا ضبط ہونا، جلاوطنی ان سب چیزوں کی تفصیلات بیتی کہانی میں موجود ہیں۔ 14 ستمبر 1857ء کو انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کیا۔ 17 اکتوبر 1857ء کو انگریزی فوج پٹودی میں داخل ہوئی۔ 17 اکتوبر 1857 کو نواب عبدالرحمن رئیس جھجھر کو گرفتار کیا گیا۔

شہر بانو بیگم نے پٹودی خاندان کی تاریخ پر بھی بات کی ہے اور بتایا ہے کہ شیخان کی وجہ تسمیہ تصوف سے لگاؤ ہے۔ 1803ء میں سرکار انگریز کی عمل داری دہلی میں ہوئی، نواب نجابت علی خان نے لارڈ لیک کی اطاعت قبول کی اور اپنی سابقہ جاگیر کی سند حاصل کی۔ دوسری سند 10 مارچ 1806ء میں ملی۔ انہوں نے اپنے والد کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> میرے ابا جان رحم دل ایسے تھے کہ کسی کے دکھ کو ہر گز نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا اس کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔[3]

بانو کے والد 15 برس کی عمر میں مسند نشین ہوئے اور پچاس برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ جب بانو کو بچے کی اُمید ہوئی تو والدہ ناراض تھیں۔ وہ اپنے بھائی محمد صادق کے گھر گئیں لیکن والدہ انہیں منت کر کے گھر لائیں۔ آٹھ دن بعد ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا لڑکے کا نام احمد علی خان رکھا گیا۔ لیکن 14 رمضان کو بانو کے خاوند بیمار ہوگئے، سر میں درد اور بیماری کی شدت محسوس کی اور 21 رمضان کو بالآخر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس صدمے کا اظہار بھی بانو کی آپ بیتی میں ملتا ہے، وہ کہتی ہیں:

> میں بیوہ ہوگئی میرا گھر برباد ہو گیا۔ میری خانما کی تباہی ہوگئی، میرے گھر کا مالک، میرے سر کا تاج، میرا افسر میرا شوہر اپنی بستی اپنی نگری کو چھوڑ کر یکایک دنیا سے کوچ کر گیا۔ ہائے ہائے وہ دن میرے واسطے قیامت کا دن تھا۔[4]

شوہر کے انتقال کے بعد قرض خواہوں نے بہت پریشان کیا۔ گھر کی آمدن 160 سے 60 رہ گئی۔ میاں 4000 کا قرض چھوڑ گئے ،یوں حالات دگرگوں ہوئی، پنشن کے لیے بھی کوشش کی گئی اور صاحب بہادر کے سامنے رحم کی اپیل بھی کی گئی۔ حاکم نے 130 روپے بچے اور 20 روپے ماں کے مقرر کیے۔

شہر بانو بیمار ہوئیں 7 ستمبر 1877ء میں فالج کا حملہ ہوا، ابھی انہیں سکون نہیں ملا تھا کہ احمد علی بیمار ہوگئے اور چار سال بیمار رہے، آخر ان کی وفات ہوئی۔ بانو نے اپنے ان حالات اور مصائب کا اظہار بھی بہت درد انگیز انداز میں ان الفاظ میں کیا:

> میری دس برس کی محنت اللہ نے آناً فاناً لے لی، ہائے کیا خبر تھی کہ اس طرح مجھ کو بے وارث کر کے آپ قبر کی گود میں جا سوئیں گے۔ میں تو یہ جانتی تھی کہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو مٹی دے گا۔ افسوس منشی تقدیر نے میری پیشانی پر یہ ہی لکھا تھا۔[5]

ہم نے سائے کی طرح وقت کو ڈھلتے دیکھا۔ بیتی کہانی امارت اور غربت کا امتزاج لیے ہوئے ہے، کہیں شادیانے بج رہے ہیں تو کہیں صف ماتم بچھی ہے۔ ایک طرف پر آسائش زندگی تو دوسری طرف غربت اور تنگی کا عالم، بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ یہ آپ بیتی دکھ اور سکھ کا سنگم ہے، قہقہے اور آہ وبکا ساتھ ساتھ چلتے ہیں، یوں بیتی کہانی انسانی زندگی کی تصویر کے دونوں رخ دکھاتی ہے، کبھی خوشی کبھی غم، محبت اور تنہائی بے بسی اور یہ آپ بیتی اپنے اندر سارا سامان لئے ہوئے ہے۔

آخر میں بانو بیگم نے ایک بہت دردناک بین کیا، جس کی گونج پوری کہانی پہ چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ایک رقت آمیز لمحہ ایک درد ناک احساس آپ بھی محسوس کیجیے:

> آپ کی خاطر سے میں نے بیتی کہانی یعنی روز پیدائش سے آج تک جو کچھ گزرا تھا وہ لکھ کر آپ کو دیا، اب تو آپ نے مجھ عاجز کا قصہ سنا، سچ کہنا کہ مجھ جیسے بدنصیب دنیا میں دیکھے کیا سنے بھی نہ ہوں گے۔[6]

اگر ہم بیتی کہانی کو اردو کی اوّلین نسائی آپ بیتی کے طور پر دیکھیں تو اس کا اسلوب جاندار اور ادبیت سے معمور لگتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے اپنی زندگی کے اہم حالات وواقعات کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف ان مناظر کو اپنے قریب محسوس کرتا ہے ہے، بلکہ تاریخی حقائق کو بھی جانتا ہے۔ یوں یہ آپ بیتی ادب، سماج، تاریخ اور برصغیر کے شاہی نظام سے جڑی ہوئی دستاویز ہے، جو نہ صرف بانو کی زندگی کی کہانی ہے بلکہ دہلی، لدھیانہ، حیدرآباد اور محل کے ماحول اور زندگی کی مکمل عکاسی کرتی ہوئی ایک ادبی دستاویز ہے۔ جسے نسائی ادب کی تاریخ میں اور اردو خود نوشت کی تاریخ میں ایک اہم ادبی سنگِ میل کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ بانو کی اپنے موضوع اور اسلوب پہ گرفت محسوس ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا مشاہدہ بھی عمیق لگتا ہے۔ اردو کی پہلی نسائی آپ بیتی ہونے کے ناطے اسے ایک مکمل ادبی و تاریخی دستاویز کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

افسانہ نادر جہاں از طاہرہ بیگم المعروف فخر النساء نادر جہاں بیگم:

بیتی کہانی کے بعد غالباً اردو کا اوّلین سوانحی ناول "افسانہ نادر جہاں" ہے جو 1901ء میں مکتبہ نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا اور جس کی مصنفہ طاہرہ بیگم عرف نواب فخر النساء نادر جہاں ہیں۔ یہ ناول سوانحی ناول ہے جو آپ بیتی کا اوّلین بیتی تجربہ کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول کی مصنفہ لکھنؤ کے ایک آسودہ خاندان کی فرد تھی اور یہ زبان دانی کے لیے مرزا نواب عباس حسین ہوش سے اصلاح لیتی تھیں، جس کا ذکر انہوں نے اپنی اس آپ بیتی میں بھی بڑے عاجزانہ انداز میں کیا ہے۔

اس آپ بیتی کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مصنفہ نے اس وقت کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی عکاسی کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم و تربیت کے مسائل کو بھی اس تصنیف کا موضوع بنایا ہے، اس حوالے سے ان کا ایک اپنا بیان دیکھا جا سکتا ہے وہ اس تصنیف کی غرض اور اس کی تقسیم کے حوالے سے خود بتاتی ہیں:

> میں نے تم صاحبو کے دل لگنے اور جی نہ گھبرانے کے خیال سے اس کتاب کے دو حصے کر دیئے ہیں۔ پہلے کا نام تم سن چکی ہو یعنی عریضہ طاہرہ، دوسرے کا لقب صحیفۂ نادرہ ہے، پہلے حصے میں میری ابتدائے عمر اور کنوارے پن کی باتیں جو اول سے آخر تک طرح طرح کی خوبیوں اور نیکیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ دوسرے حصے میں بیاہے جانے اور تجربہ حاصل کر چکنے کے بعد۔[7]

اس اقتباس کے مطالعہ سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو مصنفہ کی زبان جس پہ لکھنؤ کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے کی معاشرت میں عورت کے کنوارہ پن کی اہمیت اور سماج کا عورت کی طرف دیکھنے کا جنسی زاویہ، یہ دو باتیں اس وقت کے معاشرے میں خاص اہمیت رکھتی تھیں۔ جنسی بے راہ روی کے زمانہ میں عورت کا کنوارپن اہم ہو جاتا ہے اور پھر ایسے معاشرے کا روحانی زاویہ جیسا کہ مصنفہ نے گناہ کا اظہار کیا ہے۔ یہ سب کچھ اس خود نوشت کے ادبی زاویہ کو مضبوط کرتا ہے، آگے چل کے وہ اس زمانے کی سگھڑ عورت کی تصویر پیش کرتی ہیں اور اپنی سلیقہ شعاری کے باب میں بیان کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ:

> اللہ رکھے ذہن ایسا کہ دیکھا نہ سنا۔۔۔ نماز بالکل یاد ہے مجھے سن لیجیے، جو ایک ایک حرف بھی کسی نے بتایا ہو۔ دنیا کی نیکیاں اس کی جنم گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں، جو جیے گا دیکھ لے گا کہ سارے لکھنؤ میں لڑکی ایک ہو گی۔[8]

اپنی تعریف اتنے معصومانہ انداز میں کی کہ لوگ یقین کر لیں۔ اس وقت بھی بچیوں کی تعلیم و تربیت میں نماز، روزہ کو اتنی ہی اہمیت حاصل تھی جتنی آج۔ دوسرا اس زمانے میں بھی یادکاری کا یہی سلسلہ تھا جو آج ہے۔ بچوں کو آج بھی اسی طرح طوطا بنایا جاتا ہے جیسا کہ آج سے پہلے، اس کے علاوہ مصنفہ اس وقت کے سماج کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے بھی نظر آتی ہیں اور معاشرے کی فرسودہ رسموں کے خلاف بغاوت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، اس حوالے سے ایک اقتباس دیکھیں:

> کم سنی کی شادی بھی اچھی نہیں، دشمنی اسی دوستی کا نام ہے کہ نہ عقل کامل ہونے دی نہ سمجھ درست، دس برس کے کیڑے کو پہاڑ کے نیچے دبا دیا، چاہے اس میں اتنے بڑے بوجھ اُٹھانے کی طاقت نہ ہو۔[9]

مصنفہ نے انتہائی مؤثر انداز میں خواتین کے حقوق کے لیے آواز بلند کی ہے، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زبان پہ ان کی گرفت مضبوط ہے اور بات کہنے کا بھی سلیقہ انہیں آتا ہے۔ کم سنی کی شادی آج کے ترقی یافتہ معاشرے کا بھی مسئلہ ہے، جسے ترقی یافتہ معاشرہ حل نہیں کر سکا۔ وہی قبائلی سوچ اور عمل آج بھی ہماری زندگی ہے، جو آج سے ایک سو سال پہلے تھی۔ واہ رے انسان! تیری ترقی اور واہ رے حوا کی بیٹی کے نصیب۔

اس آپ بیتی کو نسائی آپ بیتی کے اوّلین نقوش میں دوسرا درجہ حاصل ہے، اس کے بعد قابل ذکر آپ بیتی معروف ادیبہ عطیہ فیضی کی ہے جو خطوط کی ہیئت میں لکھے جانے والی پہلی آپ بیتی کہی جا سکتی ہے۔

تحصیل علم از عطیہ فیضی:

عطیہ فیضی جب 1906ء میں انگلستان حصولِ تعلیم کی غرض سے گئیں، تو وہاں سے اپنی بہن زہرہ بیگم کو تمام احوال خط کی صورت میں لکھ کر بھیجنے لگیں۔ زہرہ بیگم یہ احوال تہذیبِ نسواں میں چھپوا دیتی تھیں۔ رسالہ تہذیبِ نسواں لاہور سے شائع ہوتا تھا اور وہ خواتین کا پہلا

اردو رسالہ تھا جس کی مدیر ایک خاتون تھیں (ان کا نام محمدی بیگم تھا) بعد ازاں یہ احوال کتابی صورت میں 1923ء میں زمانۂ تحصیل کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ محمد یامین عثمان کی تدوین اور مقدمے کے ساتھ اسے ادارۂ یادگارِ غالب نے شائع کیا ہے۔

عطیہ فیضی کا نام ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں کیونکہ ادب کی دو انتہائی قد آور شخصیات قبلہ شبلی نعمانی اور علامہ محمد اقبال اس محترمہ کی زلف کے اسیر رہے، استادِ محترم جناب وحید قریشی صاحب کی کتاب "شبلی کی حیاتِ معاشقہ" بہت عرصہ موضوعِ بحث رہی اور پھر اس کے بعد اقبال کے عطیہ کو لکھے گئے خط بھی ہمارے ادب کا ایک اہم باب ہیں۔

اس خاتون کا تعلق ایک با اثر اور صاحبِ ثروت خاندان سے تھا اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انہوں نے لندن میں جا کے تعلیم حاصل کی یہ 1906ء کا زمانہ تھا، جب علامہ اقبال بھی وہاں موجود تھے۔ یہیں ان کی ملاقات علامہ سے ہوئی، یہی ملاقات بعد میں ایک افسانہ بن گئی، کیونکہ ہمیں کہانی کار معاشرے کے طور پر جانا جاتا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

عطیہ نے قریباً تیرہ ماہ لندن میں قیام کیا اور یہاں سے انہوں نے اپنی بہن زہرہ فیضی کو کچھ خط لکھے، یہ خط بعد میں رسالہ تہذیبِ نسواں میں شائع بھی ہوئے اور ایک سفر نامے کی شکل اختیار کر گئے، چونکہ یہ خطوط ایک خوبرو خاتون کے تھے اس لیے پاکستانی قاری ان کو ہضم نہ کر سکا اور اس پہ خاصا شور ہوا، ان خطوط کے حوالے سے ایک اہم تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

> یہ خطوط لندن اور وہاں کی زندگی اور خود عطیہ کی لندن کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور ان کے تاثرات و احساسات پر مبنی ہیں، جن میں سادگی اور معصومیت ملتی ہے، کسی قسم کا تصنع، تکلف یا بناوٹ نہیں۔[10]

اصل میں تو یہ عطیہ کی آپ بیتی ایک سفر نامہ اور خطوط کی شکل میں ہے، لیکن یہ خطوط اور سفر نامہ اس قدر دلچسپ اور منظم صورت میں لکھا گیا ہے کہ اسے ہم عطیہ کی آپ بیتی بھی کہہ سکتے ہیں اور بعض ناقدین نے اسے اسی بنا پر خود نوشت کے طور پر دیکھا ہے، اس لحاظ سے یہ نسائی آپ بیتی کی تاریخ میں اہمیت کی حامل خود نوشت ہے، جسے ادیب خواتین کی آپ بیتی کی تاریخ میں اہم دستاویز کے طور پر دیکھا جائے گا۔

یہ آپ بیتی اس اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں لندن کی معاشرت اور بالخصوص طبقہ اُمراء کی زندگی کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ لندن میں گزرے شب و روز اور معمولاتِ زندگی کی جھلکیاں، اس کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیمی زندگی بھی اس خود نوشت کا حصہ ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

> ان کے ہاں لندن کی اونچی سوسائٹی، افراد اور ان کا طرزِ معاشرت، ان کے طور طریقے اور آداب کا اظہار ملتا ہے اور یہی ان کے سماجی شعور کا آئینہ دار ہے۔[11]

عطیہ کیونکہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں اس لیے معاشرے پر گہری نظر رکھتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کہ ہاں سماجی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور یہی سماجی شعور ان کے ادبی شعور کی بھی نشاندہی کرتا ہے اور بطور ادیب ان کی تحریر کے مطالعہ کی رغبت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد بھوپال کی سلطان جہاں بیگم کی آپ بیتی نسائی آپ بیتی کا نقشِ دیگر کہا جا سکتا ہے۔

تزکِ سلطانی از سلطان جہاں بیگم:

بھوپال کی خاتون حکمران سلطان جہاں بیگم نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بہت کام کیا۔ یہ ان کی آپ بیتی تھی جو تین حصوں میں تھی۔ پہلا حصہ تزکِ سلطانی 1903ء میں، دوسرا حصہ گوہر اقبال 1909ء میں اور تیسرا حصہ اختر اقبال کے نام سے 1914ء میں شائع ہوا۔ یہ آپ

بیتی جو تاج الاقبال کے نام سے بھی مشہور ہے، نواب آف بھوپال سلطان جہاں بیگم کی زندگی کی کہانی ہے جو پہلی بار 1914ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پہ آئی، نواب بیگم فطرتاً کھلے دل و دماغ کی مالک خاتون تھیں اور ایک روشن خیال، عورتوں کی ہمدرد کے طور پر معروف تھیں۔

تاریخ میں نواب صاحبہ کا ایک کارنامہ مشہور ہے کہ انہوں نے محمڈن ایجوکیشن کے جلسہ میں بمبئی میں ایک دھواں دار تقریر کی، اس موقع پر بیگم فیضی، عطیہ فیضی اور بیگم شیخ عبد اللہ جیسی نام ور خواتین موجود تھیں اور اسی جلسہ میں علی گڑھ میں خواتین کا مدرسہ قائم کرنے کی تجویز دی گئی، جسے نواب بیگم نے نہ صرف سراہا بلکہ مالی معاونت بھی کی، بیگم صاحبہ کی انہی خدمات کے حوالے سے احمد فاطمی کہتے ہیں کہ:

> تعلیمِ نسواں کی تبلیغ اور سرپرستی کے طور پر سب سے اہم نام سلطان جہاں بیگم عرف بیگم بھوپال کا لیا جاتا ہے، انہوں نے اردو کی قلمی اور مالی دونوں طرح سرپرستی کی، خصوصاً عورتوں کی تعلیم میں وہ بے حد پیش پیش رہیں، وہ بذاتِ خود ادیبہ تھیں۔[12]

نواب بیگم نہ صرف ایک سماجی کارکن تھیں بلکہ وہ ایک ادیبہ بھی تھیں، ان کی یہ خود نوشت اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی ادبی خدمات بھی لائقِ توجہ ہیں۔ انہوں نے اس کے علاوہ بھی کتب تحریر کیں جن میں ایک ادبی موضوع پہ جبکہ ایک سیرت کے حوالے سے موجود ہے۔

اس کے علاوہ نواب بیگم نے تحریکی اور اصلاحی کام بہت کیے، انہی کاموں کی بدولت انہیں قومی شناخت ملی، سماجی سطح پر ان کی گراں قدر خدمات کے حوالے سے ان کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا:

> علیا حضرت نہ صرف ایک قدیم اسلامی ریاست کی تاج دار اور حکمران تھیں بلکہ اس سے بڑی سعادت جو خدا نے علیا حضرت کو عطاء فرمائی وہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان اور خصوصاً مسلمان کے طبقہ نسواں کے دلوں کی ملکہ تھیں۔[13]

نواب بیگم کا بنیادی کارنامہ تو برصغیر کی خواتین میں سماجی و سیاسی شعور پیدا کرنا ہے، لیکن اس کے ساتھ ان خواتین کو تعلیم کی طرف راغب کرنا بھی لائقِ تحسین کارنامہ ہے، ان کی شخصیت کا تیسرا اہم پہلو ان کی ادب سے وابستگی اور علم پروری ہے، بطور ادیب خاتون کے ان کی ادبی خدمات پہ بھی مزید تحقیق کی ضرورت موجود ہے، ہاں بطور آپ بیتی نگار ان کا اسلوب سلیس اور رواں ہے۔ زندگی کو دیکھنے کا ان کا زاویہ بھی الگ ہے، اردو زبان کا بھی اچھا خاصا علم رکھتی ہے۔ ابتدائی طور پر اس آپ بیتی کو ایک خاتون ادیب کی اچھی کاوش قرار دیا جا سکتا ہے اس کے بعد کا نقش نیرنگ بخت ہے۔

نیرنگ بخت از وزیر سلطان بیگم:

اگرچہ وزیر سلطان بیگم کی یہ کتاب زیادہ متاثر کن نہیں ہے اور مصنفہ کی قسمت کے پلٹا کھانے کے حال کو جذباتی انداز میں بیان کرتی ہے، لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ طویل عرصے کے بعد کسی خاتون نے آپ بیتی لکھی تھی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مصنفہ کو طلاق ملنے کے بعد وہ عدالت گئیں اور مہر کا مطالبہ کیا، جو اس زمانے میں یعنی آج سے اسّی سال پہلے بڑی بات تھی۔

بیتی کہانی اور تزکِ سلطانی کے بعد نیرنگِ بخت تیسری خود نوشت ہے جو کسی خاتون نے لکھی ہے۔ اگر ہم ان تینوں آپ بیتیوں کا جائزہ لیں تو ایک اہم اور قابلِ غور بات یہ سامنے آتی ہے کہ مذکورہ تینوں خود نوشتیں طبقہ امراء سے تعلق رکھنے والی خواتین کی ہیں، دو کا تعلق تو شاہی خاندان سے ہے بلکہ اعلیٰ عہدوں پہ فیض شخصیات ہیں جبکہ تیسری بھی شاہی خاندان کی ہی فرد ہیں۔ ان تینوں خواتین میں ایک قدر اور بھی مشترک ہے وہ یہ کہ ان تینوں کے ہاں سماجی خدمت کا جذبہ موجود ہے۔

یہ تیسری آپ بیتی پنجاب کی وزیر سلطان بیگم کی آپ بیتی ہے جو نیرنگ بخت کے نام سے 1942ء میں منظر عام پر آئی، جس کے ناشر ذکاء اللہ حسین جالندھری تھے۔ یہ کسی ادیب کی آپ بیتی نہ تھی بلکہ ایک دکھی عورت کی کہانی ہے، اس کا تعلق کابل کے شاہی خاندان سے تھا ۔اس کی شادی ایک نوجوان سے ہوئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا شوہر اور سسرال والے تمام افراد اس پر تشدد کرتے تھے۔ اس خاتون نے انصاف کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اس تشدد سے نجات حاصل کرنے کے لیے طلاق اور حق مہر کا مطالبہ بھی کیا۔

وزیر سلطان بیگم اپنے وقت کی جرات مند خاتون تھی جس نے اپنے حقوق کے لیے آواز اُٹھائی اور ایسے وقت میں جب عورت مر تو سکتی ہے مگر اپنے شوہر کے احتجاج نہیں کر سکتی۔ ایک اہم بات کہ وزیر سلطان کے والد شیخ غلام میاں جیلانی 1870ء میں ریاست کپور تھلہ کے وزیرِ اعظم تھے، ان کی شادی بادشاہِ کابل کے خاندان میں ہوئی۔

لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اس آپ بیتی میں آہیں اور سسکیاں بہت ہیں، ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے مصنفہ کی زندگی میں نا آسودگی بہت تھی۔ بعض دفعہ تو ایسے لگتا ہے جیسے ہم راشد الخیری کا کوئی ناول پڑھ رہے ہیں۔ ان کی آپ بیتی کی ساری فضا ہی سوگوار سی ہے جس کو وہاج علوی نے اس طرح بیان کیا ہے:

> وہی شادی بیاہ کے حالات، عزیزوں اور قرابت داروں کی نوک جھونک، وہی ملبوسات کی وضع قطع اور زیورات کا ذکر ہے وہی بر محل اور بے محل اشعار کی بھرمار اور عورتوں کی بے بسی پر آنسو بہانا ہے۔[14]

اس کے علاوہ اس آپ بیتی میں پند و نصائح کے دفتر کھلے ہیں، اس اعتبار سے یہ مولوی نذیر صاحب کی ہم رکاب نظر آتی ہیں، ان اثرات کا پسِ منظر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محترمہ مولوی صاحب کی قاری رہی ہوں اور اس تحریکِ نسواں کا وہ بھی روحانی طور پر حصہ ہوں اور نظریاتی سطح پر وہ ان کے قریب ہوں۔ اس لیے سرسید تحریک کے اثرات انہوں نے قبول کیے ہوں، لیکن ادبی حوالے سے ان اثرات نے ان کی آپ بیتی کو نقصان پہنچایا ہے کہ ان کی تحریر ایک اچھی ادبی کہانی نہیں بن پائی، بلکہ ایک روایتی اور فرسودہ زندگی نامہ تشکیل پا سکا۔

بہر حال یہ کسی خاتون کی لکھی ہوئی تیسری آپ بیتی ہے جو شائع ہوئی اور جسے اردو کی نسائی ادب کی تاریخ میں اور بالخصوص نسائی آپ بیتی کی تاریخ میں اہمیت حاصل ہے، یہ خاتون بھی باقاعدہ لکھاری نہیں تھیں لیکن انہیں ادب سے ایک لگاؤ ضرور تھا۔ یہ آپ بیتی ادبی لحاظ سے تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی لیکن تاریخی اعتبار سے اور خواتین کی زندگی اور ان کی محرومیوں کے حوالے سے ایک اہم دستاویز ضرور ہے۔ یہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک باب ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زبان کے حوالے سے اس آپ بیتی کی اہمیت ضرور ہے کیونکہ اس میں خواتین کی زبان اور طبقہ امراء کا لہجہ ملتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اردو محاورہ اور سلیس اسلوب اس آپ بیتی کا امتیاز ہے، سو اس کا تذکرہ کیے بغیر نسائی آپ بیتی کی تاریخ نامکمل ہو گی۔ اس آپ بیتی پہ ایک کامل تبصرہ اور تجزیہ ملاحظہ فرمائیں:

> اس کی ادبی حیثیت بھی کسی حد تک مجروح ہو گئی ہے، بعض جگہ تضاد بیانی کے باوجود خود نوشت نگار کے کردار کی مذہب پسندی اور روایت پسندی کھل کر سامنے آتی ہے، جس میں دانش وری کا فقدان ہے اور عام گھریلو پن کی گہری چھاپ ملتی ہے۔[15]

مذکورہ بالا تبصرہ پہ غور کرنے اور اس آپ بیتی کے متن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات درست ہے، اس لیے کہ ادبی حوالہ سے یہ خود نوشت کوئی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے، البتہ اس کی حیثیت تاریخ کے ایک سنگِ میل کی ضرور ہے۔ وہ تاریخ برصغیر کے مسلم کلچر کی ہو یا خود عورت کی یا پھر ہماری نسائی ادبی تاریخ کی۔

کارِ جہاں دراز ہے از قرۃ العین حیدر:

اردو کے ابتدائی نسائی نقوش میں بہت اہم نقش قرۃ العین حیدر کی تصنیف کار جہان دراز کا ہے، اس کی صنف کے تعین میں ناقدین کے ہاں تضاد پایا جاتا ہے بعض اسے خود نوشت تسلیم کرنے سے انکاری ہیں، جبکہ بعض اسے خود نوشت کا ایک افسانوی تجربہ قرار دیتے ہیں۔ قرۃ العین نے اپنی اس کہانی کو ابتدائی طور پر کراچی اور دہلی سے قسط وار ادبی جرائد میں شائع کروایا پھر ان نو سو صفحات کو یکجا کر کے سنگ میل لاہور سے "کار جہاں دراز ہے" کے عنوان سے شائع کیا جا چکا ہے۔

کفِ گل فروش کے نام سے قرۃ العین نے اپنی تصاویری خود نوشت قبل ازیں شائع کی تھی، اسے بھی اس خود نوشت کا اب حصہ بنا دیا گیا ہے۔ کیوں کہ ان کا اسلوب افسانوی ہے اور وہ کہانی کی صورت میں بات کرنا زیادہ سہل جانتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی خود نوشت کو کہانی کا لبادہ پہنایا اور اسلوب بھی کہانی کا استعمال کیا، اس وجہ سے بعض ناقدین نے ان کی اس تصنیف کو سوانحی ناول کہہ دیا، حالانکہ بنیادی موضوع اس کتاب کا قرۃ العین کی زندگی ہے جس کی شہادت متن سے بھی مل جاتی ہے۔

اس خود نوشت کے آغاز میں انہوں نے اپنے آباء و اجداد اور خاندان کے بارے میں لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا تعلق سادات فیملی سے تھا، سادات میں ایک طرح کی نخوت اور رعونت پائی جاتی ہے جو قرۃ العین کے ہاں بالکل بھی نظر نہیں آتی، وہ جہاں بھی گئیں جہاں بھی رہیں، انہوں نے Queen Bee کی طرح زندگی گزاری، انہیں ملکہ بننے کا شوق نہیں تھا۔

اس خود نوشت کو مصنفہ نے خود ترتیب دیا جو کچھ یوں ہے:

- جلد اول۔ 1940ء سے 1947ء تک کی داستاں [تاریخ کی کہانی]
- جلد دوم۔ 1948ء سے 1978ء تک کا قصہ [پاکستانی رشتہ دار، دوست]
- جلد سوم۔ 1964ء سے تادم تحریر، کشور ہند، اعزازات و احباب کا احوال

قرۃ العین نے اپنے ڈھائی سال کی عمر کے حوالے سے بھی لکھا ہے کہ "ہم نے کہا تھا کہ ہم اردو سکول نہیں جائیں گے" یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اس حوالے سے تاریخ میں اور بھی ایسی شخصیات ملتی ہیں جنہوں نے اپنے انتہائی بچپن کے زمانے کے حوالے دیئے ہیں اور انہیں بچپن کی وہ یاد اپنے حافظے میں محفوظ نظر آتی ہے۔ سو یہ بات زیادہ تعجب خیز نہیں ہے، ایک اچھا انسان اور تخلیقی صلاحیتوں سے بہرہ مند انسان اپنے حالات زندگی کو اس حد تک جان سکتا ہے یا یاد رکھ سکتا ہے۔ بہر حال یہ بات قرۃ العین کے لیے بھی اور قارئین کے لیے بھی بہت اہم اور منفرد ہے، کیونکہ قرۃ العین نے اپنی خود نوشت کہانی کی شکل اور تاریخی تناظر میں لکھی، اس لئے بعض جگہوں پر ان کی سہل پسندی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے فالو میر افضل علی کے مسلک کے بارے میں بہت حساس نظر آتی ہیں۔ وہ انہیں شیعہ سمجھتی تھیں، جبکہ مالک رام نے انہیں احمدی لکھا جس پر قرۃ العین نے شکوہ کیا کہ آپ نے تو انہیں احمدی بتا کے دم لیا، جبکہ وہ قادیان میں دفن ہوئے۔ اس کے علاوہ انتظار صاحب کے حوالے سے ایک بات کو انہوں نے کسی اور شخص سے منسوب کر دیا ہے۔

بعض جگہوں پر کچھ غلطیاں بھی کی گئی ہیں مثلاً جاپانی شاعر یاشو کو باشو لکھ دیا ہے۔ جس سے پہلے کتابت کی غلطی سمجھا جا رہا تھا لیکن یہ مصنفہ کی خود ساختہ غلطی ہے۔ بہر حال یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ خود نوشت قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے اور اس میں دلچسپی کا مکمل سامان موجود ہے۔ قرۃ العین کا اسلوب اور زبان تو بہر حال لاجواب ہے۔ اس پر بات کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس خود نوشت کا خلاصہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ۔

یہ اردو کی نسائی آپ بیتی کے ابتدائی نقوش ہیں جو نسائی آپ بیتی کی تفہیم میں مد گار ثابت ہو سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اردو میں خواتین کی آپ بیتی کی تاریخ مکمل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مذکورہ آپ بیتیاں برصغیر میں خواتین کی زندگی کو سمجھنے اور ان کی نظر سے زندگی کو دیکھنے کا ایک پیمانہ اور زاویہ فراہم کرتی ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

1 شہر بانو بیگم، "**بیتی کہانی**"، مرتبہ: معین الدین عقیل، (حیدر آباد: علمی ادارہ، 1995ء)، ص44-

2 ایضاً، ص52-

3 ایضاً

4 ایضاً، ص115-

5 ایضاً، ص122-

6 ایضاً، ص131-

7 نادر جہاں بیگم، "**افسانہ نادر جہاں**"، (لکھنؤ: نول کشور پریس، 1901ء)، ص8-

8 ایضاً

9 شاداب سید، "**اردو میں خواتین کی خود نوشتیں اور سماجی سروکار**"، (بمبئی: حسن پبلی کیشنز، 2008ء)، ص225-

10 ایضاً، ص147-

11 ایضاً، ص148-

12 سلطان جہاں بیگم، "**تزکِ سلطانی**"، (انڈیا: بھوپال پریس، 1914ء)، ص110-

13 شاداب سید، "**اردو میں خواتین کی خود نوشتیں اور سماجی سروکار**"، (بمبئی: حسن پبلی کیشنز، 2008ء)، ص13-

14 وہاج علوی، "**اردو میں خود نوشت فن و تجزیہ**"، (دہلی: جامعہ اسلامیہ، 1989ء)، ص297-

15 شاداب سید، "**اردو میں خواتین کی خود نوشتیں اور سماجی سروکار**"، (بمبئی: حسن پبلی کیشنز، 2008ء)، ص14-